© rasailojaraid.com

مباحثہ ومکالمہ

خورشید احمد ندیم*

قادیانی مسئلہ

مجلس تحفظ ختم نبوت نے سانحہ لاہور پر جو بیان جاری کیا ہے، اس میں کہی گئی ایک بات بطور خاص اہل مذہب اور ریاست کی توجہ چاہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ قادیانیت کے خلاف ہیں، قادیانیوں کے نہیں۔ یہ جملہ اگر ہماری سمجھ میں آجائے تو شاید ہم اس آزمائش سے بخیر نکل سکیں، جس کا بطور قوم ہمیں اس وقت سامنا ہے۔ ۱۹۷۴ء سے پہلے قادیانیت ایک سماجی مسئلہ تھا۔ جب ریاست نے اس گروہ کو غیر مسلم قرار دیا تو اس کے بعد یہ ایک ریاستی مسئلہ بھی ہے۔ گویا اب اس کا ایک پہلو قانونی بھی ہے۔ ضروری ہے کہ اس معاملے کی ان دو جہتوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے سمجھا جائے۔ جہاں اس کا تعلق سماج سے ہے وہاں یہ معاشرتی مسئلہ ہے، جہاں معاملہ قانون کا ہے وہاں اس کا تعلق ریاست سے ہے۔ جب ہم اسے معاشرتی حوالے سے دیکھتے ہیں تو ہم پر علما کا کردار واضح ہوتا ہے۔ ریاست کی مداخلت وہاں ہوگی جہاں معاملہ قانونی ہوگا۔ اس فرق کو اگر سمجھ لیا جائے تو شاید ہم اس پیچیدگی سے محفوظ ہو جائیں جس میں اس وقت الجھ گئے ہیں۔

مسلمانوں کے معاشرے میں علما کا ایک مستقل کردار ہے جسے قرآن مجید انذار سے تعبیر کرتا ہے۔ (سورہ توبہ ۹:۱۲۲) اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر معاشرے میں کہیں اخلاقی فساد پیدا ہوتا ہے یا کسی گروہ یا فرد کی طرف سے دین کی مخالفت ہوتی یا اس میں اضافے یا کمی کی جسارت کی جاتی ہے تو وہ اس باب میں لوگوں پر حق واضح کر دیں۔ واضح کرنے کا مطلب ہے، اپنی بات کا ابلاغ کر دینا۔ یہ اگرچہ ایک مسلسل عمل ہے لیکن اس کا دائرہ یہی ہے یعنی ابلاغ۔ یہی وہ کام ہے جو اس امت کی تاریخ میں دعوت و تبلیغ کے عنوان سے جاری ہے۔ ہماری پوری تاریخ میں جید علما کا یہی کردار رہا۔ انہوں نے اگر حکمرانوں کی طرف سے دینی انحراف دیکھا تو انہیں متوجہ کیا۔ اگر خود علما کے گروہ کی طرف سے دینی ضروریات کی خلاف ورزی ہوئی تو انہیں متنبہ کیا۔ اگر معاشرے میں کوئی خلافِ دین تصور پھیلا تو اس پر عوام کی راہنمائی کی۔ قرآن مجید کے مطابق اس کام کی بنیادی شرط تفقہ فی الدین ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو دین کا گہرا فہم رکھتا ہے۔ یہ عام مسلمان کا کام نہیں ہے۔ دعوت کے حوالے سے اس کا دائرہ عمل سورہ عصر میں بیان ہوا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ اس طرف ایک مسلمان بیک وقت داعی ہے اور مدعو بھی۔ البتہ معاشرے اور قوم کی سطح پر یہ کام وہی کرے جو دینی علم کا حامل ہو۔

قادیانیت کے باب میں بھی علما کا کردار یہی ہے۔ وہ معاشرے کو بتائیں گے کہ یہ تعبیر کیسے دین کے بنیادی مقدمات کے خلاف ہے اور کہاں یہ عقیدہ دینی مسلمات سے متصادم ہے۔ یہ کام وہ تحریر، تقریر اور ابلاغ کے دیگر میسر ذرائع کی مدد سے کریں

*چیئر مین ادارہ برائے تعلیم وتحقیق پاکستان۔ کالم نگار روزنامہ اوصاف۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گے۔اس حوالے سے ان کے مخاطب ایک طرف قادیانی ہوں گے اور دوسری طرف عام مسلمان۔دعوت کا یہ کام خیر خواہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔اس میں وقار ہوتا ہے اور دردِ دل بھی۔اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اپنی غلطی پر متنبہ ہو اور اس ضلالت سے نجات حاصل کرے جس میں وہ آپ کے خیال میں مبتلا ہے۔مناظرہ نہ صرف دعوت سے مختلف بلکہ اس کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔یہی سبب ہے کہ رسوخ فی العلم رکھنے والوں نے ہمیشہ اس سے گریز کیا ہے۔امام غزالی نے زندگی کا ایک حصہ اس کی نذر کیا لیکن بعد میں جب ان پر اس کے مضر اثرات واضح ہوئے تو اس طرزِ عمل سے رجوع کر لیا۔قادیانی مسئلے میں جہاں یہ دردِ دل اور عالمانہ وقار برقرار ہے وہاں ہمیں اس دعوے کا ثبوت ملتا ہے کہ کیسے لوگ قادیانیوں اور قادیانیت میں فرق کر رہے ہیں۔میرے نزدیک ہماری روایت میں اس کی بہترین مثال مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''قادیانیت'' ہے۔میرا مشورہ ہے کہ یہ کتاب ہر قادیانی کو اس لیے پڑھنی چاہیے کہ وہ جان سکے کہ اہلِ اسلام نے اس کے مسلک کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا ہے ،اس کی علمی بنیادیں کیا ہے۔اسلوب کی شائستگی اسے مجبور کرے گی کہ اس کا دھیان نفسِ مضمون پر رہے۔یہ کتاب ردِ قادیانیت پر کام کرنے والوں کو اس لیے پڑھنی چاہیے کہ کیسے قادیانیوں اور قادیانیت میں فرق کیا جاتا ہے۔

یہ بات مجھے اس لیے کہنا پڑی ہے کہ ہمارے ہاں بد قسمتی سے قادیانیت اور قادیانیوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔اگر میری جسارت کو معاف کیا جائے تو میرے نزدیک اس کی وجہ مجلسِ احرار ہے۔یہ قادیانیوں کے خلاف اٹھنے والی پہلی عوامی تحریک ہے۔اس کی قیادت خطیبوں کے ہاتھ میں تھی۔خطیب کا مخاطب لوگوں کے جذبات ہوتے ہیں،ذھن اور فکر نہیں۔اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ عوام سے دادِ تحسین وصول کرے۔سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے ایک مرتبہ اپنے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تم کانوں کے عیاش ہو۔کامیاب خطیب وہی ہے جو اس عیاشی کا اہتمام کرتا ہے۔میں یہ بات اپنے تجربے کی بنیاد پر بھی کہہ سکتا ہوں۔میں نے بچپن میں تقریریں سننے کے لیے بارہا میلوں پیدل سفر کیا۔میں نے کئی مرتبہ سردیوں کی راتیں مسجد میں گزاریں کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد رات گئے گھر جانا ممکن نہیں تھا۔کم و بیش تین عشروں کے اس تجربے کے بعد میں پورے اطمینان کے ساتھ شاہ صاحب کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ اس مشقت کا اصل محرک کانوں کی عیاشی تھا۔اگر میرا رجحان مذہبی نہ ہوتا تو میں اپنے ذوقِ سماعت کی تسکین کے لیے گانوں کی مجالس یا سینما گھروں کا رخ کرتا۔ہمارے ہاں خطیب مسلکی ہوتے ہیں یا سیاسی ۔ان کی مقبولیت کا راز اس میں ہے کہ وہ دوسرے فریق کی تذلیل،تمسخر یا رد کا کتنا اہتمام کرتا ہے۔

احرار کا ہدف بدقسمتی سے قادیانیت کی بجائے قادیانی بن گئے کیونکہ فنِ خطابت کی ضرورت یہی تھی۔یہی اسلوب بعد میں بھی برقرار رہا۔اب بجائے یہ بتانے کے کہ قادیانیت کیسے اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے،سارا زور اس پر صرف ہونے لگا کہ قادیانی کیسے اسلام،مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔اس اسلوب کے غلبے سے قادیانیوں میں ایک ردِ عمل پیدا ہوا اور ان میں اصلاح کی بجائے دفاع کا جذبہ ابھرا۔دوسری طرف ایک عام مسلمان پر یہ اثر ہوا کہ اس میں قادیانیوں سے نفرت اور ناپسندیدگی پیدا ہوئی۔ماہرین نفسیات بتاتے ہیں کہ تشدد کی اساس بھی انتہائی نفرت ہوتی ہے۔میرا احساس ہے کہ اگر اس تحریک کی قیادت خطیبوں کے بجائے مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے کسی جید عالم کے پاس ہوتی تو قادیانیوں کی دوسری یا تیسری نسل میں شاید ہی کوئی ہوتا جو اپنی گمراہی پر اصرار کرتا۔

۱۹۷۴ء میں جب ریاست نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا تو اس معاملے کی نئی جہت سامنے آئی۔یہ ملک کے سب سے بڑے آئین ساز ادارے کا فیصلہ تھا۔اس میں قادیانیوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا مرزا ناصر پارلیمان کے سامنے پیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے اور اپنا دفاع کیا۔ اس فیصلے کے چند قانونی مضمرات تھے۔ مثال کے طور پر اگر وہ غیر مسلم ہیں تو انہیں ایسے مذہبی شعائر کے اعلانیہ استعمال سے روک دینا چاہیے جس سے عام آدمی کے لیے مغالطے کا کوئی امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ضیا الحق صاحب کے دور میں بعض قوانین بنے جن کے تحت انہیں مسجد اور اس نوعیت کے الفاظ کے استعمال سے روک دیا گیا۔ قادیانیوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ ان کے اس ردعمل سے اس معاملے کی نوعیت ایک عام مذہبی یا مسلکی تنازعے کی نہیں رہی۔ اب یہ ریاست اور ایک گروہ کے مابین ایک اختلاف تھا۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں سے آئین اور دستور کے تحت معاملہ کرے اور انہیں قانون کا پابند بنائے۔ اگر کوئی گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ آئین یا اس کے کسی ایک حصے کو نہیں مانتا تو ریاست اس کا حق رکھتی ہے کہ وہ نفاذِ آئین کے لیے کوئی اقدام کرے۔ تاہم حق حاصل ہونے کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ اس کو لازماً استعمال کیا جائے۔ اس کا انحصار حالات پر ہے۔ پاکستان میں ریاست نے عام طور پر ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ مثال کے طور پر وہ قانوناً مسجد کی طرح عبادت گاہ تعمیر نہیں کر سکتے لیکن ہم نے دیکھا کہ لاہور میں جو عبادت گاہ دہشت گردی کا نشانہ بنی، وہ ایک عام مسجد کی طرح تھی۔

ریاست نے جب قادیانیوں کے خلاف فیصلہ سنایا تو اب ان کی ناراضی کا ہدف خود ریاست تھی۔ یہ بات قابلِ فہم ہے۔ یہ فیصلہ کسی مذہبی گروہ کا نہیں بلکہ ایک ایسی حکومت کا تھا جس کو اپنے مذہبی تشخص پر کبھی اصرار نہیں تھا۔ اس سے انہیں یہ تاثر ملا کہ غیر قادیانی بحیثیت مجموعی ان کے خلاف ہیں۔ یہی وہ گرہ ہے جس کے نہ کھلنے سے شکوک کا ایک جنگل آباد ہوا اور قادیانیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹانے کا مطالبہ سامنے آیا۔ لوگ جب قائداعظم کی طرف سے سر ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ بنانے کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اس بڑی تبدیلی کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ۱۹۷۴ء میں آئی ہے۔ اب ریاست نے ان کے خلاف ایک فیصلہ سنایا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے بعد ریاست کے ساتھ ان کے جذبات کی نوعیت اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ریاست کے فیصلے کے بعد اب اس تنازعے کے تین فریق ہیں: مذہبی گروہ بالخصوص جن کا ہدف قادیانی ہیں، قادیانی اور ریاست۔ اگر یہ تینوں مل کر یہ مسئلہ حل کرنا چاہیں تو میرا خیال ہے کہ اس میں بڑی حد تک کمی آ سکتی ہے۔ مذہبی گروہ کے طرزِ عمل پر میں پچھلے کالم میں اپنی اصولی رائے دے چکا۔ قادیانیوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جب انہوں نے ایک مذہبی تعبیر کو اختیار کر لیا ہے تو اس کے کچھ ناگزیر مضمرات ہیں۔ ایک یہ قادیانیت کو اختیار کرنے کے بعد غیر قادیانی مسلمانوں کے ساتھ ان کا جو مذہبی اختلاف پیدا ہوا ہے، اس کی نوعیت دیوبندی بریلوی اختلاف کی نہیں ہے۔ قادیانیوں کے نزدیک غیر قادیانی مسلمان نہیں ہیں۔ غیر قادیانیوں کی طرف سے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے سے بہت پہلے قادیانی بزرگ یہ فتویٰ دے چکے۔ اگر آج کسی قادیانی کو شک ہو تو اِس کے لیے اسے اپنے علما سے رجوع کرنا چاہیے۔

خود مرزا صاحب نے پاکستانی ریاست کے فیصلے سے ۷۴ سال پہلے، ۱۹۰۰ء میں، یہ فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں: ''مجھے الہام ہوا ہے کہ جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا، وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہوگا'' (معیار الاخبار)۔ ایک اور جگہ لکھا: ''خدائے تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔'' (ذکر الحکیم)۔ ان کے ایک خلیفہ اور قادیانی جماعت کے مرکزی پیشوا مرزا بشیر الدین محمود نے ''آئینہ صداقت'' میں لکھا: ''کُل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں''۔ اسی طرح جب ۱۹۷۴ء میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پارلیمنٹ نے مرزا ناصر سے یہ پوچھا کہ وہ غیر قادیانیوں کو کیا سمجھتے ہیں تو انہوں نے کسی ابہام کے بغیر جواب دیا ''کافر''۔اس بنا پر قادیانیوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ان کے نزدیک جب غیر قادیانی مسلمان نہیں ہیں تو اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ غیر قادیانیوں کے نزدیک وہ غیر مسلم قرار پائیں۔اب جس ریاست میں غیر قادیانیوں کے حکومت ہوگی، وہاں لازماً ان کے بارے میں وہی فیصلہ ہوگا جو پاکستانی پارلیمان نے کیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ملک کی باگ ڈور قادیانیوں کے پاس ہوگی تو وہ غیر قادیانیوں کے بارے میں یہی فیصلہ دیں گے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ قادیانیوں کا اس بات کا ادراک کرنا چاہیے۔جب انہوں نے ایک مذہبی تعبیر اختیار کی ہے تو اس کا یہ ناگزیر نتیجہ ہے جسے کسی طرح زیادتی نہیں کہا جا سکتا۔اگر وہ یہ مان لیں تو اس کے بعد وہ اس ریاست کے اسی طرح شہری ہیں جس طرح کوئی دوسرا ہے۔

غلط یا صحیح کی تقسیم سے قطع نظر، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ نئی نبوت کا دعویٰ لازماً ایک نئی امت کو جنم دیتا ہے اور اس امت کا حصہ بننے کا انحصار اس نبی کے اقرار پر ہوتا ہے۔یہ ایک سماجی حقیقت ہے جس کا تعلق کسی مذہبی عقیدے سے نہیں ہے۔جب مرزا صاحب نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو انہوں نے ایک امت کی بنیاد رکھ دی۔ یہ پہلے سے موجود امت سے علیحدگی کا اعلان ہے۔اس کے بعد پہلی امت کا حصہ بننے پر اصرار سماجی حقائق کا عدم فہم ہے۔یہ معاملہ صرف اسلام کے ساتھ نہیں ہے۔مسیحیت میں بھی ایسا ہی ہے۔کم وبیش اسی دور میں جب مسلمانوں میں مرزا صاحب کا ''ظہور'' ہوا، مسیحیت میں جوزف سمتھ نے دعویٰ نبوت کیا۔اس نے کہا کہ وہ حضرت مسیح کا سچا پیرو کار ہے۔وہ عہد نامہ قدیم وجدید دونوں کو مانتا تھا۔۱۸۳۰ء میں اس کی کتاب (Book of Mormon) شائع ہوئی۔اس کا دعویٰ تھا کہ سنہری الواح (Golden Plates) پر لکھی یہ الہامی ہدایت تھی جو ایک فرشتے نے اس تک پہنچائی جسے اس نے الہیاتی صلاحیت سے ترجمہ کیا۔امریکا میں اس کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو ریاست یوٹا (Utah) میں آباد ہے۔سالٹ لیک سٹی ان کا مرکز ہے۔یوٹا کا شمار امریکا کی امیر ترین ریاستوں میں ہوتا ہے۔مجھے وہاں جانے اور مارمنز کے مراکز دیکھنے کا اتفاق ہوا۔بہت آسودہ حال لوگ ہیں۔ان کا مرکز جدید ترین سہولتوں سے آراستہ ہے اور وہاں اتنا خوبصورت اور جدید اڈیٹوریم ہے کہ امریکا میں شاید ہی کوئی دوسرا ایسا شاندار اڈیٹوریم ہو۔مسیحی انہیں مرتد کہتے اور اپنی امت کا حصہ نہیں مانتے۔بالکل یہی معاملہ اسلام اور قادیانیت کا ہے۔اگر وہ اپنے مسلمان تشخص پر اصرار نہ کریں تو ریاست کے ساتھ ان کا تنازعہ ختم ہو جاتا ہے اور معاشرے کے ساتھ بھی۔

اس کے بعد ریاست کا کردار شروع ہوتا ہے۔ریاست نے عملاً یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کی حیثیت ذمی کی نہیں، معاہد کی ہے۔انہیں وہ سب حقوق حاصل ہوں گے جن کا وعدہ قائداعظم نے ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو اس ملک کے شہریوں سے کیا تھا۔ پوری قوم شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً پابند ہے کہ اس وعدے کی پاسداری کرے۔ریاست کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے نفاذ کو یقینی بنائے۔اس کے بعد کسی کو ان کی جان، مال، عبادت گاہوں اور املاک پر کسی تصرف کا حق نہیں ہوگا۔ان کا یہ حق مسلمہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی گزاریں۔وہ ریاست کے اہم مناصب پر فائز رہ سکتے ہیں اور مذہبی حوالے سے ان کے ساتھ کوئی امتیاز جائز نہیں ہوگا۔

میری علما سے درخواست ہے کہ وہ اس پہلو سے عوام اور قادیانیت کو اپنا مخاطب بنائیں۔قادیانی اس کا ادراک کریں اور ریاست آگے بڑھ کر ایسی صورت نکالے کہ یہ معاملہ قانون اور دستور کے مطابق اس طرح حل ہو کہ یہاں بلا امتیاز مذہب سب کی جانیں اور املاک محفوظ رہیں۔ (بشکریہ روزنامہ اوصاف)

© rasailojaraid.com